زاہد امروز

خود کشی کے موسم میں

خودکشی کے موسم میں
(نظمیں)

ISBN:969-8379-92-6

پہلی اشاعت: مارچ/۲۰۰۹ء

سرورق: عمار انجم

زاہد اِمروز

P-13 نزد ابوبکر مسجد، سعید کالونی-1، فیصل آباد

+92-321-6633168

zahidimroz@gmail.com

زیراہتمام
آج کی کتابیں

سٹی پریس بک شاپ

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: (92-21) 5650623, 5213916

ای میل: info@aajurdu.com, ajmalkamal@gmail.com

ندا محسن کے نام

ترتیب

پیش لفظ

آپ کی کتاب "خودکشی کے موسم میں" نے مجھے خاصا مضطرب رکھا ہے۔اِس میں یہاں وہاں خارجی دُنیا کے حوالے اور بیانیہ کا معنوی ربط موجود ہے اور فرداً فرداً ہر نظم میں موضوع کے اعتبار سے ایک ہیئت شکل پذیر ہوتی نظر آتی ہے۔بیشتر نظمیں ذات کے مسائل کی پیدا کردہ نا آسودگیوں سے جنم لیتی ہیں۔میرے خیال میں شناخت کا مسئلہ اور وجودی کرب شاعر کے غم اور اِس غم کے اِظہار کا ماخذ ہیں۔"میں اپنی شناخت چاہتا ہوں" جیسی نظمیں اِسی غم کی نشان دہی کرتی ہیں۔غمِ ذات کا تجربہ خواہ کتنا ہی گہرا ہو اِسے خارج سے گُزر کر ہی ایک اِستعاراتی نظام وضع کرنا پڑتا ہے۔اور یوں فرد کا درد ایک شعوری کاوش کے ذریعے دردِ مشترک بنتا ہے۔ورنہ تو کہنے اور سننے میں تفہیم کا خلا پیدا ہو جائے۔یہ نظمیں خود کلامی بلکہ داخلی خود کلامی کی تکنیک میں لکھی گئی ہیں لیکن شاعر کی ہنروری یہ ہے کہ اِن میں کہیں کہیں لاشعور کی تھوڑی سی دراندازی کے باوجود کوئی ابہام پیدا نہیں ہوتا۔یہ بڑی خوبی کی بات ہے کہ بیشتر نظمیں اپنے مرکزی موضوع کی پابند نظر آتی ہیں اور ہر داخلی تجربہ ایک شعوری حد بندی کے تابع رہتا ہے۔یہی بات میرے لئے اطمینان بخش ہے کہ ایک اچھا شاعر اپنی ذات کے سفر میں درپیش خودکشی کا موسم کاٹ لے گا۔یہ ایک وعدہ فزا آغاز ہے۔اِس میراتھن ریس کا کشت کاٹنے کے لئے تو ابھی عُمر پڑی ہے۔اِس مجموعے کی ہر نظم اپنی ہیئت کے اعتبار سے مکمل نظر آتی ہے۔نثری نظم کا اِتنا compact ہونا بجائے خود اس صنفِ شاعری میں اضافے کی دلیل ہے۔یہ نظمیں ذات کے اندر جھیلی ہوئی غم کی وارداتیں ہیں۔۔کہیں شخصی نوعیت کی اور کہیں وجودی سطح کی۔یہ نظمیں زندگی اور اِنسانی صورتِ حال کے بارے میں

بنیادی نوعیت کے سوال اٹھاتی ہیں جو ہمیں نا آسودہ کر دیتے ہیں۔ اِن نظموں کی فکری جہتیں او ریجنل بھی ہیں اور معنی آفریں بھی۔ مثلاً

میں جمع ہو کر کم پڑ گیا ہوں
کہیں ایسا تو نہیں
اِرتقا کی جلد بازی میں
میں نے دو نفی جوڑ لیے ہیں؟

استعارے اور امیجز مختلف بھی ہیں اور منفرد بھی۔ اندازِ بیاں میں شعریت بھی ہے اور تازہ کاری بھی۔ کتاب کے عنوان نے مجھے خاصا ہراساں کیا ہے۔ میں ایک اچھے شاعر کی خیر و عافیت کی دعا کرتا ہوں۔

آفتاب اِقبال شمیم

دسمبر ۲۰۰۸

یادوں کی اَنی پر رقصِ درویش

اکثر شاعر اپنی شاعری میں موجود نہیں ہوتے مگر زاہد امروز پابلو نیرودا کی طرح اپنی شاعری میں موجود ہے اِس لیے اس کو اپنے آپ کو خودکشی کے موسم میں ڈھالنے، دریا کی طرح رواں دواں رہنے، وقت کی دھڑکنوں میں گونجنے، بلند پہاڑوں کی پُراسرار چوٹیوں سے ہم کلام ہونے، پرندے کی مانند خاموشی کے اندر سے اُڑان بھرنے میں قطعاً کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ وہ محبت کی جھیل میں موسموں کی کشتی سے گہرے پانیوں پر شاندار مسافتیں تحریر کرتا ہے۔ ایسے مقام پر تنہائی اُس کے دل کے آسمان پر سرمئی یادوں کے بادلوں کی طرح اُمڈ کر آتی ہے۔ اور اس کی نظموں کے لفظوں کو جل تھل کر دیتی ہے۔ یہ کیفیت بھی دراصل اپنی طرف لوٹنے کا ہی عمل ہے جہاں کئی شاعر اپنے آپ سے ملاقات کا لمحہ پہچاننے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ امروز نے وہ جگہ دریافت کر لی ہے جہاں وہ با آسانی اپنے آپ سے ملاقات کر سکتا ہے لیکن جب وہ اُس جگہ پہنچتا ہے تو پہلے سے ہی خود کو وہاں اپنا منتظر پا کر اپنی حیرانی خود تخلیق کرتا ہے۔ دراصل تخلیقی شاعری کا یہی وہ لمحہ ہے جو زاہد اِمروز کے تعارف میں شامل ہے۔

زاہد اِمروز کی نظمیں دکھ اور محبت کے موسموں کی رازدار بیلیں ہیں جن کے خوش نما پھول وقت کی قید سے آزادی کا جشن منا رہے ہیں۔ میرے لیے حیران کُن بات یہ ہے کہ اِمروز کی نظمیں پڑھتے ہوئے میری ملاقات اچانک اپنے ہی قبیلے کے ایک شاعر سے ہو جاتی ہے جس کی شاعری کی پرورش تنہائی کی راہداریوں، دل کے ناہموار موسموں، ناآسودہ خوابوں، درد کے

صحراؤں، ہجر زدہ شاموں، دل کے قافلوں کی راہ میں چھپے ہوئے رہزنوں اور لگاتار بارشوں نے کی ہے۔اسی لیے اِمروز کی شاعری چرواہوں کے قبیلے کی روحانی قدروں کا خواب نامہ ہے۔محبت کے چرواہوں کے قبیلے سے تعلق رکھنے والا یہ شاعر انتہائی خاموشی سے ایک لازوال محبت کی کہانی کے کرداروں کی ورق گردانی میں مصروف ہے۔اُس کی شاعری کے سارے اَن دیکھے منظر اُس کی ذات کے صحرا میں پھیلتے اور سمٹتے فاصلوں کی اوٹ سے اچانک نمودار ہوتے ہیں۔خودکشی کا جو موسم اِمروز نے تخلیق کیا ہے وہ انسانوں کی purification سے مماثلت رکھتا ہے۔اور میرے خیال میں یہ یادوں کی اَنی پر رقصِ درویش کا انوکھا قصہ ہے۔

مظہرالاسلام

فروری ۲۰۰۹

ذات کی دیوار پر لکھی تحریر

زندگی نے جتنی محبت سے گلے لگایا تھا سوچا بہت آسان ہے جینا۔ جب ہم چھوٹے تھے تو سمجھتے تھے زندگی کا سب سے بڑا لطف برسات کی بارشوں میں نہانا اور سب سے زیادہ بہادری کا کام جون کی سورج زدہ گلیوں میں ننگے پاؤں بلا خوف بھاگنا ہے، مگر وقت زندگی کی لگام میں تھام کر چلتا ہے۔ شاخ سے کلی توڑی تو لگا کائنات کتنی معطر ہے۔ جھک کر دیکھا تو پاؤں سے لہو بہہ رہا تھا اور میرے کپڑوں میں کانٹے چمٹے ہوئے تھے۔ اُس دن میری آنکھ نے آنسو دیکھا اور میں نے پہلا دکھ کمایا۔ خون کے رنگ سے آشنا ہوا تو محسوس ہوا درد بھی رنگین ہوتا ہے۔ جب میں نے پہلا سچ بولا تو میری زبان سے خون نکل آیا۔ میں نے اس رنگینی کا ذائقہ بھی چکھ لیا۔ خواب میں تھوتھمانے والا بچہ ایک نئی لذت سے آشنا ہوا مگر یہ خون کی لذت بہت جان لیوا تھی۔ بچپن میں اسے سہنا آسان نہیں تھا، سو یہ رستا ہوا خون تھوکنا پڑا اور آنکھیں خون کی رنگت سے ہٹانا پڑیں۔

میں زندگی کی ہنسی میں کود گیا۔ دنیا ہنستی تو میں بھی اپنی باچھیں پھیلا دیتا۔ زمانے کی تجوری سے تھوڑی گدگدی چراتا اور اپنی پسلیوں پر چھوڑ دیتا۔ خوب ہنستا، لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ میں ابھی زندگی آشنا نہیں تھا۔ مگر خون کی رنگت اور درد کی لذت میرے لاشعور کا حصہ بن چکی تھی۔ تب تک مجھے چھپنا آ گیا تھا، سو میں واش روم جاتا اور موم بتی جلا کر شعلے میں زندگی کی سرخی تلاش کرتا۔ دیوار پر چلتا ہوا کیڑا پکڑ کر شعلے پر رکھتا، زندگی کا تماشہ دیکھتا، خوشی کشید کرتا اور موم سے گیند بنا کر کھیلنے لگتا۔ گراؤنڈ میں کھیلتے ہوئے اچانک میں سب سے الگ ہو جاتا اور اُداسی میرے گرد حلقہ بنا لیتی۔

ایک نامعلوم بے چینی مجھے ڈستی رہتی ۔نوعمر تھا، سمجھ ہی نہ آتی کیا ہوگیا ہے ۔ایسا کیوں ہوتا ہے کہ میرا رنگ بدلنے لگتا ہے ۔اپنی عمر کی طرح گاؤں کی کچی گلیوں میں چاندنی راتوں میں ہم چور سپاہی کا کھیل کھیلتے ۔میں چھپ جاتا تو سامنے آنے سے بہت ڈرلگتا ۔مجھے محسوس ہوتا ،اگر سب کی آنکھ سے چھپا بھی رہا تو اپنے ہاتھوں پکڑا جاؤں گا۔ میں کئی کئی دن اپنے باطن میں چھپا رہتا، یہاں تک کہ اذیت ہونے لگتی ۔اس مفت کے کرب سے تنگ آجاتا تو اُٹھا کر پرے پھینک دیتا۔

احساسِ گناہ سے میں تب واقف ہوا جب میں نے پہلی بار اپنے باپ کی جیب سے پیسے چرائے ۔میرا باپ چلّایا اور اُس کی چیخ مجھے چیرتی چلی گئی ۔دراصل میں نے پیسے نہیں ،ناوانی میں اُس کا مان چرا لیا تھا۔یونہی کم عقلی کے زمانے میں زندگی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے میں ایک رات سو گیا۔

صبح اُٹھا تو بلوغت کا ادراک میرے جسم پر چپکا ہوا تھا۔اس دن سے میرے شعور نے مجھ سے سوال کرنا شروع کر دیے اور خون کا ذائقہ پھر سے میری زبان پر محسوس ہونے لگا ۔مگر اس بار میں نے کوئی سچ تو نہیں بولا تھا! ......شاید میرے اندر اُٹھنے والے سوالات مجھ سے سچ تلاشنے کا مطالبہ کر رہے تھے ۔جواب ڈھونڈنے کی خاطر میں زندگی کریدنے لگا۔سورج کے گریبان میں جھانکتا، پھولوں کی خوشبو مٹھی میں بھرنے کی کوشش کرتا، جگنوؤں سے دوستی کرتا، روشنی کو قریب سے چھو کر دیکھتا مگر اُسی طرح ہاتھ میں سوال لیے کھڑا رہتا۔خدا کو آواز دیتا مگر کوئی جواب نہ آتا ۔میری آواز آسمان سے ٹکرا کر پلٹ آتی ۔مجھے تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ رات دیر تک گلی کی موڑ پر سٹریٹ لیمپ کے نیچے بیٹھا اُن تمام سوالوں کے جوابات سوچتا، میرا شعور جن کا مطالبہ کرتا۔

سچ اور جھوٹ کے رنگ اور ذائقے مختلف ہوتے ہیں ۔ان کی پہچان مجھے بہت پہلے ہو چکی تھی ۔سچ دیکھنا ایک خواب ٹھہرا تو میں خواب میں زندگی گزارنے لگا۔اسی خواب میں مجھے محبت ہوئی تو گہرائی ماپتے ہوئے خواب در خواب کودتا چلا گیا۔محبت نے مجھے زندگی آشنا کیا تو معلوم پڑا کہ ان جوابات کے لیے عمر درکار ہے اور میں تو ابھی بہت نادان ہوں ۔وقت میرے کنارے چھو کر آگے بڑھ جاتا ۔میں اس سے چند لمحے چھین کر تنہائی اوڑھتا اور یادیں تعمیر کرنے نامعلوم سفر پر

نکل جاتا۔ درختوں کی چھاؤں سونگھتا، اُڑتی خاک میں چہرے تلاش کرتا اور آنسوؤں کا ذائقہ چکھتا۔اِس تنہائی میں میرا خودکشی کی طرف رُجحان بڑھ جاتا۔ بہت زیادہ بھیڑ میں، بارشوں کے موسم میں یا کسی بڑی خوشی کے موقع پر، ایک گہری اُداسی میرے وجود میں پھیل جاتی۔ اپنی سالگرہ کے دن کیک کاٹتے ہوئے، جب سب لوگ میرے گرد دائروں میں کھڑے تالیاں بجارہے ہوتے، میری آنکھیں بے اختیار آنسوؤں کی جھیل میں بدل جاتیں۔ تب مجھے ادراک ہونے لگا کہ بے نام غم میں رونا کیا ہوتا ہے۔ لازمی نہیں آنکھ میں نمی کا محرک کوئی واقعہ یا تن پر لگی کوئی چوٹ ہو۔ اَنا پر لگنے والی ضرب بہت سلگتی ہے لیکن بعض اوقات ہم بنا کسی تکلیف، بغیر کسی وجہ کے رونے لگتے ہیں۔

حقیقت اور خوابوں سے کشید کیے ہوئے یہ تجربے میں اپنی پوٹلی میں جمع کرتا رہتا۔ زندگی جو دیتی میں خوشی سے قبول کر لیتا کیوں کہ ''زندگی جتنا سکھاتی ہے / ہم اتنا سیکھتے ہیں'' اور سوچتا۔

ابھی تو اُڑنا سیکھ رہا ہوں

ابھی تو میرے پر نکلے ہیں

اپنے نازک دودھیا پروں کو دیکھتا، جن پر ابھی سماج کی گرد اور حادثات کی دھند نہیں پڑی تھی، جن پر ابھی جھوٹ اور فریب کا رنگ نہیں چڑھا تھا۔ میرے سارے سوال تشنہ رہے تو میں نے ان نامعلوم راستوں کا رُخ اپنی ذات کی جانب پھیر لیا۔ اب میں خود سے نکلتا، گھومتا پھرتا اور بالآخر اپنے ہی اندر پہنچ جاتا۔ تھک کر سوچوں کی چھت تلے لیٹ جاتا، جس کا بیرونی رُخ شعور اور اندرونی لاشعور ہوتا ہے...... چپ چاپ لیٹے ہوئے آنکھ چھت کو گھورتے گھورتے تھک کر نیند کا مطالبہ کرتی تو چھت قطرہ قطرہ میرے چہرے پر ٹپکنے لگتی۔ محبت اپنے گداز بھرے ہاتھوں سے ان ٹھنڈے قطروں میں حدّت بھرتی تو میں سو جاتا۔

صبح اٹھتا تو میرے پہلو میں ایک نظم اونگھ رہی ہوتی، جس کے قلب میں وہ سوال اپنے جواب کے ساتھ لپٹا ہوتا جسے میں رات ساتھ لے کر سویا تھا۔ مگر جب نظم کو پلٹ کر دیکھتا تو دوسرے رُخ ایک اور سوال جنم لے چکا ہوتا۔ میں حیران ہوتا اور پریشانی میرے ماتھے پر پسینہ بن

کر بہنے لگتی۔ یوں میں شاعری کرنے لگا۔ ہر نظم کے بعد لمحاتی سکون اور وقتی تشفی تو ہونے لگی مگر بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اب میں بہت کم باہر جھانکتا کیوں کہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ سماج کی شعوری حد بہت محدود ہے اور اس کے پاس بھی میری طرح فقط سوال ہی سوال ہیں۔ تنہائی گہری ہوتی جا رہی تھی جب محسوس ہوا کہ سماج کی سوچوں پر تو موم جما ہوا ہے۔ وہی موم، جس سے میں بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ دراصل بچپن میں سب ایک سے تھے، مگر فرق وہاں پیدا ہوا جب میں نے بہت جلد اس موم کے گیند سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ لوگ بہت عرصے تک اس سے کھیلتے رہتے ہیں اور یہی موم وقت کے ساتھ پگھل کر اُن کی سوچوں پر جمنے لگتا ہے۔

جھوٹ کا ذائقہ کبھی میری زبان کو اچھا نہیں لگا۔ میں کیا کروں؟ سچ کی لذت میں چکھ چکا ہوں۔ اس سارے عمل کا عادی ہو گیا ہوں۔ نامعلوم کا کرب میری سانسوں میں گھلا ہوا ہے اور شعری تجلّی سے اس کے ادراک کی کوشش کرتا ہوں۔ اب میں باہر نکلتا ہوں، زندگی سے تجربے چراتا ہوں، اُن پر سے احساسِ گناہ جھاڑتا ہوں اور ہر رات تھک کر اپنی ذات کی چھت سے ٹپکتے ہوئے قطروں کا نشہ کرتا ہوں۔ اس نشے میں تخلیق ہونے والی نظمیں جب لوگوں نے دیکھیں تو کچھ نے دل پر ہاتھ رکھ لیے، کچھ نے کانوں پر اور چند ایک نے تسلی دینے کے لیے میرے کندھے پر۔ لوگوں نے آنکھیں ملیں اور پھر سے انھیں پڑھا۔ اُن کے منہ سے بے اختیار گالی نکلی۔ اُس دن میں نے پہلی گالی کمائی اور اپنی پوٹلی میں رکھ لی۔ شاید ان نظموں میں تڑپتی حسرت اور بلکتے سوالوں نے اُن کے سینوں میں چھپے سوالوں کو پہچان لیا تھا۔ مگر میں کیا کروں۔ خاموش رہوں تو خون ہو جاؤں اور بولوں تو مجرم ـــ مجھے مجرم بننا پسند ہے، خود پر جبر کرنا نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ مصنوعی پھولوں میں خوشبو پھونکتا رہوں اور دیواروں پر پتے کندہ کر کے اُن میں رنگ بھرتا پھروں۔ میں رات کی دیوار پر چاک سے تحریر تو لکھ سکتا ہوں مگر زندگی کی زنگ آلود سلیٹ پر جھوٹ کا روغن نہیں چڑھا سکتا۔

زیادہ دیر باہر جھانکوں تو سہم جاتا ہوں۔ خون میں لٹکتی ہوئی روایت کی زنجیر کھینچنے سے ڈرتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو اِس کی کڑیاں میرے اندر بکھر جائیں اور میں مر جاؤں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، اپنے ان سوالوں کے جوابات ڈھونڈنے کے لیے، اپنی محبت کی تکمیل کے لیے، اپنے

آپ کی شناخت اور شعور کی پیاس بجھانے کے لیے۔ یہ نظمیں میرے لیے فقط نظمیں نہیں بلکہ وہ سوالات ہیں جن کے لیے میں نے اب تک اذیت سہی ہے، اور وہ محرومی ہے جو سماج نے میری جھولی میں پھینکی ہے۔ انہیں پڑھیے اور انحراف کے الزام میں آپ بھی گالی دیجیے۔

زاہد امروز

فیصل آباد

خودکشی کے موسم میں

وقت کے نام ایک خط

زندگی بہت مصروف ہو گئی ہے
جو خواب مجھے آج دیکھنا تھا
وہ اگلی پیدائش تک ملتوی کرنا پڑا ہے
بچپن میں لگے زخم پر مرہم رکھنے کے لیے
ڈاکٹر نے ابھی صرف وعدہ کیا ہے
کل کے لیے سانسیں کماتے ہاتھ
صبح تک چائے نہیں پی سکتے
لیکن گھبراؤ نہیں
سب کی یہی حالت ہے
وہ بتا رہی تھی

اس نے اپنی سہاگ رات تب منائی
جب وہ حیض کے برس گزار چکی تھی

زندگی بہت مصروف ہو گئی ہے
اپنی ساری پونجی بیچ کر
میں نے چند لمحے یہ کہنے کے لیے خریدے ہیں
کہ جب کبھی میں مر گیا
تو کوشش کرنا
مجھے اگلے جنم سے ذرا پہلے وفنا دینا

اِستعمال شدہ محبت

محرومیاں میرا لحاف رہی ہیں

میں نے ہمیشہ دوسروں کی لعاب زدہ روٹیاں چبائیں

اور پرندوں کے زخمی کیے ہوئے

پھلوں کا خون چکھا

میرے پھیپھڑے صرف گدلی ہوا سہہ سکتے ہیں

شفافی مجھے نابینا کر دیتی ہے

اس لیے میں بارش کے بعد آسمان نہیں دیکھتا

میں اپنی ماں کا دوسرا بچہ ہوں

مجھے کیا معلوم ---!

پہلی محبت کیا ہوتی ہے

باپ میرے لیے بلیاں لے کر آیا

لیکن مجھے ہمیشہ کووں کی صحبت میں رہنا پڑا

میں نے اب تک

دوسروں کی اُترن پہنی

اور مجھے زمانے کی تھوکی ہوئی زندگی جینا پڑی

مگر انسان کب تک ایسے رہ سکتا ہے

کاش......!

میں تمہاری پہلی محبت ہوتا

بے بسی موت کا تحفہ بھیجتی ہے

جنوری کی بارشیں
مجھے خودکشی پر مائل کرتی ہیں
تنہائی مجھے مسلسل گھورتی رہتی ہے
مگر اس سے بچنے کے لیے
میں کسی کا سایہ بھی نہیں مانگ سکتا
دوستی کی دعوت دینے کے لیے
مجھے کبھی الفاظ نہیں ملتے
لوگ اپنے بستر کی گرمائش کما کر
رات بھر بوسوں کے تحفے بھیجتے ہیں
اور میں سفید پوشی کا الزام اتارنے کے لیے

جسم سے برف جھاڑتا رہتا ہوں
میں دریاؤں کی تلاش میں آوارہ پھرتا ہوں
اور آبشاروں کی موسیقی گنگناتا ہوں
میں کبھی تراشیدہ پگڈنڈیوں پر نہیں چلتا
کیوں کہ راستہ مجھے خلاؤں میں چھوڑ آتا ہے

میں برف کے سفید دنوں میں محسوس کرتا ہوں
میرے اندر کی فضا ایک جھیل میں بدلنے لگتی ہے
جس کی ناقابلِ پیمائش تہوں میں
مچھلیاں غم آلود پودے نگل کے مرجاتی ہیں
جس کے کناروں سے پرندے
شام ڈھلے تنہائی کے گیت چگ کر
اپنی قبریں تعمیر کرنے لوٹ جاتے ہیں

نیم لباسی کا نوحہ

تمہاری محبت کو زندگی دینے کے لیے
میں نے تو اپنے سارے بت توڑ لیے
مگر تم نے جواباً
اپنے کعبے پر غلاف چڑھا لیا
فقط طواف سے میری تشفی نہیں ہو سکتی
میں کیسے تمہارے اندر جھانکوں
بے بسی نے مجھے مینڈک بنا دیا ہے
میں اپنی ذات کے کنوئیں میں پڑا ہوں

اور خواہش میرے خون میں
رسّی کی طرح لٹک رہی ہے
میں کپڑوں میں بھی فحش کہلایا
تو لباس میری قید کیوں ہے؟
مجھے رنگت نہیں احساس درکار ہے
کیونکہ آنکھوں سے زیادہ میرے ہاتھ پیاسے ہیں

لازمی نہیں صرف آنکھ سے رویا جائے
اور رونے کے لیے بہترین جگہ
واش روم ہی ہو سکتی ہے
جہاں میں اپنی نیم لباسی تھوک کر
تمہارے نام کا غسل کر سکتا ہوں

میں اپنی شناخت چاہتا ہوں

ایک اداسی ہے
جو مجھ سے دوستی کرنا چاہتی ہے

ایک کھنڈر ہے
جو ہر روز میرا گھر بننے آتا ہے

ایک سایہ ہے
جو تہہ در تہہ مجھ پر لپٹتا رہتا ہے

ایک روشنی ہے
جو مجھے فاش کرنا چاہتی ہے

ایک اندھیرا ہے

جو میرا تعارف ہونا چاہتا ہے

ایک انتظار ہے

جو بار بار مجھے دوہراتا ہے

ایک پودا ہے

جو میری آنکھ میں جڑیں پھیلا رہا ہے

ایک خدشہ ہے

جو میری خاموشیوں میں چیختا رہتا ہے

ایک اشارہ ہے

جو میرے ہاتھ پر پلکیں جھپکنا سیکھ رہا ہے

ایک گھنٹی ہے

جو میری روح کے دروازے پر بجتی رہتی ہے

ایک رنگ ہے

جو مجھے میلا کر رہا ہے

ایک موسیقی ہے
جو لکنت لہجے میں مجھے گنگناتی رہتی ہے

ایک تنہائی ہے
جو مجھے سمندر کرنا چاہتی ہے

ایک لڑکی ہے
جو میرا بادبان بننے آتی ہے

اور ایک میں ہوں
اپنا چہرہ شناخت کرنے کے لیے
فٹ پاتھ پہ بیٹھا دیکھتا رہتا ہوں
بے چہرہ لوگوں کو

اپنی تلاش میں نکلنے کا انجام

میں نے گھڑی میں وقت باندھا
اور اپنی تلاش میں نکل گیا
سمندر نے میرا سارا جسم چوس لیا
اور صحراؤں نے میرے جسم کی ریت چرائی
چیونٹیوں نے بڑے اتفاق سے
میری حسیں برابر تقسیم کر لیں
دیواروں نے میرا سایہ چاٹ کر
مجھے دھوپ کے ڈھیر پر پھینک دیا
چوہوں نے میری سوچوں میں بل بنا لیے

میں نجات کی خاطر
بلیوں کا تعاقب کرنے لگا
جنگل نے مجھے وحشت پہنا دی
میں تمام رات بھیڑیوں سے ڈرتا رہا

صبح ایک انسان نے مجھے کاٹ لیا

اُروشی

اُروشی!

تم نے کب سمجھی محبت کی کہانی

تم کو کیا معلوم!

دھڑکتے جسم میں بہتی حرارت کے تعاقب میں

کہاں تک بھاگنا پڑتا ہے

جسموں کی کثافت اور نم آلود خوشبو

خواب میں تحلیل کرنے میں

زمانوں جاگنا پڑتا ہے

اپنی آنکھ کے منظر میں اپنا ہی برہنہ جسم کب دیکھا ہے تم نے!!

کب چکھی تم نے کسی انسان کی مٹی کی چکناوہٹ!

رشی کے پھول سے انساں میں ڈھلنے کے عمل میں

درد سے گزری نہیں ہو

تم کبھی اِندر کی صحبت سے نہیں نکلی

ادھر وِکرم کو دیکھو!

جس کی ازلی حسرتوں میں اپسراؤں کی رفاقت جیتنا شامل ہے

لمحہ بھر رفاقت اوڑھنے کی خواہشوں میں

کبھی تو سلطنت قربان ہوتی ہے

کبھی گردن پہ اپنے ہی لہو کی دھار پھرتی ہے

کبھی جب بات بنتی ہے

سروتی جھیل ویرانی کی چادر تان لیتی ہے

محبت اور جسمانی ضرورت کا تعلق

مسامی زاویوں سے جان لیتی ہے

اُروشی!

تم بہت نادان ہو

بارش کو بادل سے الگ پہچانتی ہو

اگر یہ مختلف ہیں تو

زمیں اور آسماں کا باہمی رشتہ کہاں ملتا ہے؟

کیا عورت فقط چھاتی کے میٹھے ذائقوں

اور ران کی لذت سے بڑھ کر کچھ نہیں؟

تم اپسرا ہو

ایک عورت کے بدن سے مختلف ہو

تم نے کب جانا

محبت تو شرائط کی لکیروں میں نہیں رہتی

کبھی بھی بینک کے لاکر کی پابندی نہیں سہتی!!

*چند مناسبات کی بنا پر "اُرَوشی" کو "اُرُوشی" باندھا گیا ہے

ایک عوامی نظم

ہم خالی پیٹ سرحد پہ
ہاتھوں کی امن زنجیر نہیں بنا سکتے
بُھوک ہماری رانیں خشک کر دیتی ہے
آنسو کبھی پیاس نہیں بجھاتے
رجز قومی ترانہ بن جائے
تو زرخیزی قحط اُگانے لگتی ہے
بچے ماں کی چھاتیوں سے
خون چوسنے لگتے ہیں
کوئی چہروں پہ پرچم نہیں بناتا
اور یومِ آزادی پر لوگ
پھلجھڑیاں نہیں، اپنی خوشیاں جلاتے ہیں

فوج کبھی نغمے نہیں گنگنا سکتی
کہ سپاہی کھیتیاں اُجاڑنے والے
خودکار اوزار ہوتے ہیں

کیا پھول نوبیاہتا عورت کے بالوں
اور بچوں کے لباس پر ہی جچتا ہے؟
کاش۔۔۔!
وطن کی حدود کے تعیّن کے لیے
پھولوں کی کیاریاں
آہنی تاروں کا متبادل ہوتیں!

ایک بدقسمت پودے کی کہانی

اُس نے مجھے مار ڈالا

اور میرا عضو اُس وقت کاٹ دیا

جب میں بلوغت خرید چکا تھا

میں کبھی نازک نم دار مٹی نہیں چھو سکا

وقت نے ایک عرصے تک

مجھے اندھیرے سے باندھے رکھا

شہوت ان دیکھے راستوں سے مجھے ڈستی رہی

اور میری نیندوں نے ہمیشہ برہنہ خواب بُنے

اُس نے مجھے دفنا دیا

وہاں ایک پھل دار پودا اُگا

جہاں سے عضو کاٹا گیا تھا

تب سے اس پودے کا پھل چکھنے والا ہر شخص

بانجھ بچے جنتا ہے

نئی صدی کا قومی ادب

(ذی شان ساحل کے لیے)

مسکراہٹ بھری نظمیں لکھنے کے لیے
میٹھے چشموں کی بہتی نمی
اور چہچہاتے پرندوں کے پروں میں
اٹی سبز گھاس چاہیے ہوتی ہے
شرارت بھرا لطیف احساس
کچے بیروں کا رس مانگتا ہے
گہری مصروفیت میں سے کچھ وقت بچانا پڑتا ہے
کہیں اکیلے بیٹھ کر ضائع کر دینے کے لیے

خوشگوار نظمیں سننے کے لیے
پَو پھٹنے سے پہلے جاگنا پڑتا ہے
گاتے پرندوں کی اُدھ پکی
ایک ایک لائن چگنے کے لیے
دیر تک کان لگائے بیٹھنا پڑتا ہے
انڈے سے نکلتے چوزے کی پہلی آواز سننے کے لیے

کبھی کسی جذبے کی تلاش میں

بھیڑوں کا تعاقب کرتے ہوئے

میلوں بھیڑیا بن کر چلنا پڑتا ہے

ہم کہاں سے ایسی نظمیں بنائیں!

ہماری آنکھوں نے تو اب تک

اُڑتی آگ اور اندھی روشنیاں دیکھی ہیں

ہمارے کانوں نے صرف موت کی سرسراہٹ سنی ہے

نعروں کے شور سے ہماری صبحیں بیدار ہوتی ہیں

اور ہر روز قتل ہوتی کئی آوازوں کے ساتھ

ہمارا سورج ڈوب جاتا ہے

چور دروازہ کھلا رہتا ہے

میرے خواب زخمی ہوئے

تو دنیا کے سارے ضابطے جھوٹے لگے

میں نے زندگی کے لیے بھیک مانگی

مگر آبا لجھوں کی پوجا کے لیے

وقت کبھی میرے لیے نہ رکا

مجھے ویسٹ زون سے اپنائیت محسوس ہوئی

لوگ کاغذوں سے بنے کھلونے تھے

جنہیں ہمیشہ خلافِ مرضی ناچنا پڑا

بھیگے ساحلوں کی ہوا میں خون ہی خون تھا

جھیلوں کے آباد کنارے مجھے بنجر کر گئے

پانی پر تیرتا منظر دغاباز نکلا

میں مخالف سمت بہتی کشتیوں میں

بیک وقت سوار ہو گیا

بادل برس گئے

تو آسمان پر دھواں رہ گیا

میں نے خود کو دھویں میں اڑایا

اور مصروفیت سے سودا کرلیا

قدیم زندگی کی نئی معنویت

میں نے رات خواب دیکھا

میری موت آج شام چھ بج کے چھبیس منٹ پر واقع ہوگی

اُس وقت بادل، جمے ہوئے سارے آنسو بہا دے گا

فضا میں روشنی کانپنے لگے گی

اور آسمانی مخلوق برہنہ دیکھی جا سکے گی

تیز آندھیوں سے دھرتی کے دکھ ہوا میں اڑنے لگیں گے

سب کی آنکھیں آبشار بن جائیں گی

میرے مخالفین کشتیاں بنانے لگیں گے

اُس وقت میں بستی کے سب سے اونچے پہاڑ پر

اپنی بقا کے لیے لکڑیاں کاٹ رہا ہوں گا

اپنے لیے زندگی اکٹھی کرتے ہوئے

میں نے وقت دیکھا

گھڑی پر چھ بج کے چھبیس منٹ ٹھہرے ہوئے تھے

تھکی ہوئی بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ

اپنی روح کو پہاڑ پر وداع کرتے ہوئے

میں بستر پر واپس لوٹ آیا

سب کچھ اپنے وقت پر واقع ہوا

خدا کی گھڑی پر چھ بج کے چھبیس منٹ بیدار ہوئے

تو بلا اجازت میرا جسم ٹٹولا جانے لگا

تب تک میری گھڑی پانچ منٹ سفر کر چکی تھی

وقت گزر گیا

میں مسکرایا

اور پہاڑ پر جمع کی ہوئی زندگی لینے چلا گیا

پارلیمنٹ

دوہرے پن نے ہمیں کوے بنا دیا
گلہریاں ہمارے ذہنوں میں
چٹکیاں بھرتی رہیں
ہماری سوچوں میں بیک وقت
برف اور آگ گری
ہم اتنے بے خبر تھے
کہ تجریدی تصویروں میں
اپنے چہرے تلاش کرتے رہے

ہم نے بادل سے خدا تراشا
اور سورج سے دوستی کی
اب ہمارے فیصلوں سے
سیلن نہیں سوکھ رہی

زخمی خوابوں کی تیسری دنیا

صدرِ مملکت نے
اپنی دولت کو ضرب لگائی
اور پرائے ملک میں ایک قبر کرائے پر لے لی
تا کہ اُس کی لاش محفوظ رہے

روشنی نے دُنیا کا سفر کیا
مگر کسی عدالت میں اِنصاف نہ ملا
کہ اندھے ترازُو نے تو کبھی آنکھیں ہی نہیں کھولیں
دیواریں تمام رات جاگتی رہیں
سامان پڑا رہا
لیکن گھروں سے لڑکیاں چُرالی گئیں

ایک جسم کو کئی جسموں نے چھُوا
تو بے چاری روحوں نے اپنے چہروں پر قے کی

لڑکی ماں تو بنی بیاہی نہ گئی
اُس نے آنسوؤں سے غسل کیا
مگر پاک نہ ہوئی

ہمیں دنیا میں ہی دوزخ ملی
کیونکہ ہم اُس لڑکی کے گھر پیدا ہوئے
اُس کا باپ فاقے سے مر گیا
اور ماں بیوہ خوابوں کی گھٹن سے!

اُس رات چاند کو قتل کر دیا گیا
اور ہم بھائیوں نے
ویران سڑک پر خودکشی کر لی

ہمارا بستر جاگتا رہتا ہے

ہم ایک بستر پر سونے کے عادی تھے
بے آواز گفتگو ہمارے خواب تعمیر کرتی
اور ہم زمانے کی آنکھوں میں چنگاری پھینک کر
اس کی حرارت سے نیند سلگاتے ہوئے
اپنی سرگوشیوں میں حدت بھرتے
مگر ایسے زمانہ سماعت سے نہیں
صرف حسِ باصرہ سے محروم ہوتا ہے
جو اپنے چہرے پر نامانوسیت رکھ کر
ہمارے درمیان نفرت کے کنکر اگتا ہے

نیم توجہ سے زمانہ دیکھنے کی غفلت نے
ہمارے خواب پتھریلے کر دیے ہیں
ہم اپنے بیچ پھیلتی اجنبیت کو کیسے عبور کریں؟
اپنے پہلو میں سونا ضرورت بن گیا ہے

میں تنہائی بانٹنے کے لیے

تمھاری یاد کے سگریٹ پینے لگا ہوں

بے سُود خیالوں کا دھواں مجھے گھیرے رکھتا ہے

اور میں تمھارے گرد دائرے تراشتا رہتا ہوں

بستر رات بھر مجھے پکارتا رہتا ہے

میں موم بتیوں کی خاموشی چراتا ہوں

اور روشنی سے آنکھیں ملاتے ہوئے

بے آواز گفتگو کرنے لگتا ہوں

میری نیندوں میں دھویں کی بُو پھیلی ہے

میں اپنی ضرورت کے ہاتھوں کم پڑا
تو ایک اور جسم سے ادھار کیا
اس کی محبت ادھوری رہی
اس نے نیا تعلق تراش لیا
میں نے راہگیروں پر پتھر پھینکے
اور سینے کے کوئلے ٹھنڈے کیے
اس نے رقیب کے خط
میرے نام پوسٹ کیے
اور نیند کی گولیاں کھا کر
محبت کا حق مہر ادا کیا
میں اپنے خون میں بارود بچھا کر
چنگاریوں کے خواب دیکھنے لگا
تب سے میری نیندوں میں
دھویں کی بُو پھیلی ہوئی ہے

اپنے اندر سے راستے کی تلاش

دیوار میرا مقدر رہی ہے

عقیدہ یہی بتاتا ہے

قید ماں کے پیٹ سے جنم لیتی ہے

میری آواز دیواریں نہیں پھلانگ سکتی

تو اندر کا خلا کیسے عبور کرے گی

پیاس بجھانے کے لیے

مجھے اپنے ہی ہونٹ چوسنا پڑیں گے

میں اپنا جسم کہاں کہاں سے ڈسوں

ایک خواہش کا خون دوسری کو جنم دیتا ہے

سوئمبر ھا میرا معالج نہیں ہو سکتا

تسلی اب میرا پہناوا نہیں رہی

پیٹ بھر لینا کافی نہیں

بھوک میرے جسم میں

کئی راستوں سے کھود سکتی ہے

موت کبھی میری ترجیح نہیں ٹھہری

اس لیے میں نہیں چاہتا

میرے ہاتھ میرا مستقبل بن جائیں

انسان کا آخری سہارا وہ خود ہے

دیوار ہو یا دریا

پانی اپنا راستہ تراش لیتا ہے

تھوکا ہوا آدمی

زندگی نے مجھے لکیر پر چلنا سکھایا
میں نے منحرف ہونا سیکھ لیا

اُس کی اندامِ نہانی
سانپ جننے میں مصروف رہی
اور وہ انہیں مارنے میں
وہ بھی کیا کرتی
رات بھر میری جگہ اژدھا سویا رہا

اپنی بے کاری سے تنگ آ کر
میں اپنا عضو نیلام کرنے چلا آیا
"ایسا کرنا جرم ہے"
مگر کیا کیا جائے

ایک بھوک مٹانے کے لیے دوسری خریدنی پڑتی ہے

عدالت نے میری آزادی کے عوض

میرے خصیے مانگ لیے

لوگوں نے میرے مادۂ تولید سے

دیواروں پر پھول بنا لیے

اور عبادت کے لیے میرا عضو

ماتھے پر ٹانک لیا

انحراف نے مجھے کبھی قطار نہیں بننے دیا

میں نے ہمیشہ چیونٹیوں کو گمراہ کیا

ایک دن تنگ آ کر

زندگی نے مجھے تھوک دیا

اپنے لیے ایک نظم

اپنی محبت کی تکمیل کے لیے
میں نے لوگوں کے خوابوں کا لمس چرایا
یکسانیت پانے کے لیے
ہمیں انتظار کے صحرا عبور کرنا تھے
لیکن ہم کب تک بے منزل راستوں سے سیپیاں چنتے
تمہارے ہجر میں تپ کر
میرا خون بخارات میں ڈھل گیا
میرے اندر ریت ہی ریت پھیل گئی
اپنی پیاس بجھانے کے لیے میں رونے لگتا
اور مسلسل اپنے اندر گرتا رہتا
تمہیں خبر ہی نہ ہوئی
جسم چھو لینے سے محبت ماند نہیں پڑ جاتی

تمہارے بعد، میں تنہائی میں مبتلا تا رہتا ہوں

مگر قے کرنے سے ڈرتا ہوں

کہیں دل نہ اگل دوں

میں نہیں چاہتا

میری ذات کا کرب

خون کے رشتے چھلنی کر دے

کیا ہمیشہ ایسا ہوتا ہے؟

(ندا محسن کے لیے)

ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟؟

کہ اپنے لیے بہترین محبت کا انتخاب کرتے ہوئے

ہمارے چہرے بے رنگی چاٹنے لگتے ہیں

کتنا اذیت ناک ہوتا ہے

جب دو لمحے رفاقت کے بعد

عمر بھر کے لیے ویرانی کو دلینا پڑتی ہے

خدا سے مصافحہ کرنے کی خواہش میں

ہماری جھولیاں زمانے کی دشمنی سے بھرنے لگتی ہیں

ہم زندگی بھر صرف ایک مرد

اور ایک ادھوری محبت کماتے ہیں

ہم اتنے مشترک ہوتے ہیں

کہ لکیر ہمارا مقدر لکھتی ہے

اور ہم خاموش مسکراہٹ کے ساتھ

اُس کا استقبال کر لیتے ہیں

مجھے لکیر کی قید میں چھوڑ جانے والو!

کیا تم بتاؤ گے

ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟؟

کوئی کشتیوں کی ہم سفری نہ کرے

میں سمجھتا تھا

محبت کا سب سے بڑا تحفہ ابدیت ہے

مگر تعلق کو ابدیت دینے سے پہلے

ہمیں ایک نفرت پالنا پڑتی ہے

نفرت پالنے کے لیے رقیب ضروری ہوتا ہے

لیکن رقابت داری بناتے ہوئے علم ہونا چاہیے

کہ آپ کی ہم خواب بھی

آپ سے سمندر کے پانیوں جتنی محبت کرتی ہے

ساحل میرا رقیب تھا

میں لاعلمی میں بہتا رہا

اور کبھی نفرت نہ کر سکا

سردیوں کی ایک شام

آبی پرندوں کے پروں کے ساتھ

میں نے اسے ابدیت تحفہ دی

جواباً اس نے مجھے

سمندری سفر کی تنہائی پہنا دی

میں بے منزل کشتیوں کا ہم سفر ہو گیا

اس نے آباد ساحلوں سے دوستی کر لی

تضاد کی کاشت

میں نے کئی رنگ کے سائے سونگھے ہیں
مگر دیواروں پر کندہ کیے پھولوں میں
کبھی خوشبو نہیں مہکی
محبت روح میں تب اُترتی ہے
جب غموں کی ریت اور آنسوؤں سے
ہم اپنے اندر شکستگی تعمیر کرتے ہیں

جس قدر بھی ہنس لو
نجات کا کوئی راستہ نہیں

تم محبت کے گنہگار ہو

سو غم تمہاری ہڈیوں میں پھیلا ہوا ہے

اپنے عمیق تجربے سے بتاؤ

ایک محبت ماپنے کے لیے

ہمیں دوسری محبت کیوں تلاشنا پڑتی ہے؟

میں جمع ہو کر کم پڑ گیا ہوں

کہیں ایسا تو نہیں

ارتقاء کی جلد بازی میں

میں نے دو نفی جوڑ لیے ہیں؟

ایک حادثے کا پس منظر

کس قدر حبس ہے

سانسوں میں پسینہ اتر آیا ہے

بادل اوڑھ کر سو جانے سے

زرخیزی نہیں جاگ سکتی

ہمارا کشکول اب صرف مسافت کما کر لوٹتا ہے

اپنے اندر جھانکو

تمہارے پھیپھڑے زنگ آلود ہو چکے ہیں

نقطہ انجماد سے گر جانا بزدل حرکت ہے

بارش ہمارے لیے اب رحمت نہیں رہی

اپنا پیٹ بھرنے کے لیے

وقت بھیک مانگنے آیا

تو زمین نے اس کا بازو و چرا لیا

معاملے سلجھانے کے لیے

ذہنی علاقوں میں کرفیو لگانا ہو گا

تم ایک کردار تو بن سکتے ہو

مگر عنوان نہیں

اس سے پہلے کہ اندھی کہانی میں

بے موت مار دیے جاؤ

خود کش حملہ کر دو

گنجان شہر میں پھیلی اجنبیت

اپنے جسم کی بنجر زمین میں

سورج اگانے کے لیے

میں نے چنگاریاں کاشت کیں

تو راکھ میرا رزق بنی

میں نے تتلیوں کی ہنسی چرائی

مگر جگنوؤں نے ہنسنے کے لیے

مجھے اپنے ہونٹ نہ دیئے

پھول کبھی میرے لیے نہیں مسکرائے

میری وراثت میں آنسوؤں کی نمکینی آئی

پہاڑوں کی سفید چوٹیاں

میرا واحد سہارا تھیں

کوہ پیماؤں نے پہاڑ فتح کیے

تو میں تنہا رہ گیا

میں نے شہر کو مٹھی میں بھر کے دیکھا
یہ دو چار قہقہوں سے زیادہ نہ تھا
تب مجھے اپنا وجود بہت بھاری لگا
وحشت نے مجھے درندہ بنا دیا

اب نجات اِسی میں ہے
میں پہاڑوں میں غار بناؤں
اور شیروں سے دوستی کرلوں

میرے لیے صرف میں بچا ہوں

خاموش رہو

میں ابھی بکھرنا نہیں چاہتا

ضرورت میری آنکھیں مانگ رہی ہے

میں اپنا غم روؤں یا تمہارے آنسو پیوؤں

تجارت بہت پیچیدہ ہو گئی ہے

میرے پاس صرف میں ہی بچا ہوں

سو تمہیں سہارا دینے کے لیے

میں خود کو بانٹ نہیں سکتا

اپنے بچاؤ کی خاطر

مجھے اپنا خون پینا پڑے گا

اور پیٹ پر بھوک باندھنی ہو گی

مجھے اُدھیڑنے کے لیے
وقت نے میرا ازار بند کھینچ لیا
تو مجھے کمر پر سانپ باندھنا پڑا
جنگل میری ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا
میں کیا کروں
شہر نے میرے خون سے ایندھن کشید کرنے کی دھمکی بھیجی ہے

تمہارے قدموں کی چاپ مجھے چیر دیتی ہے
خاموش رہو
اور میرے چھپنے کے لیے میرا جسم خالی کر دو

میرا کوئی دوست نہیں

چیخیں مجھے کبھی رہا نہیں کرتیں
مجھے معلوم ہے
ہر منظر میں ایک چیخ چھپی ہے
میں جہاں بھی جاتا ہوں
کوئی نہ کوئی چیخ مجھے پہچان لیتی ہے
میں اپنی خاموشی کی مخالف سمت
خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگتا ہوں
اِسی بوکھلاہٹ میں چیخوں کے کئی جُھنڈ
مجھے بھڑوں کی طرح گھیر لیتے ہیں
بھاگتے ہوئے میں قبرستان میں پہنچ جاتا ہوں
جہاں ہر قبر میں ایک چیخ دفن ہے
مجھے دیکھ کر
چیخیں میرے گرد ہوا میں تیرنے لگتی ہیں
اور مجھ سے چیخ بن جانے کا مطالبہ کرتی ہیں

بقا کی جنگ لڑتے ہوئے

اب میرے ہاتھ بازوؤں سے گرنے والے ہیں

اور سہارے کے لیے میرا کوئی دوست نہیں

میں محسوس کر رہا ہوں

میرا چیخوں سے بندھا ہوا جسم

جب گونجنے کے قریب ہوگا

میں کسی خشک دریا کے کنارے

سرخ رنگ میں ٹھوری چیخ بنا لوں گا

اور مٹی میری قبر بنانے میں مصروف ہوگی

زندگی کا دوسرا موسم

زندگی کا پہلا موسم وداع ہوا
اور بدن کا آخری پتہ بھی جھڑ گیا

باپ نے الوداعی ہاتھ ہلاتے ہوئے
اپنے پاؤں واپس کھینچ لئے
ماں کی ساری دعائیں مرجھا گئیں
مجھے دینے کے لیے
اُس کے پاس صرف آنسو ہی بچے
سوچوں کا بوجھ بدن سے بڑھ گیا
مگر میرے گھٹنے بھی کمزور تھے
میں زمین پر گرا
تو خاک سے مجھے بہت مشابہت ہوئی

بھیک مجھے کبھی ہضم نہیں ہوئی

اور کسی دفتر میں

میرے نام کی کوئی ملازمت نہیں پڑی

میں عورت ہوتا

تو جسم بانٹ کے سانسیں خرید لیتا

زندگی کے دوسرے موسم کا آغاز ہے

اور میری نحیف برہنہ شاخیں

سرد خزاں اور جھانکتی آنکھوں سے خوف زدہ ہو کر

ایک عورت کی طرح سہمی ہوئی ہیں

عالمی ظالموں کے نام (۱)

دغابازی میرا مصرف نہیں

میں نے کئی بار لوگوں کے اِرادوں سے

خودغرضی کی جڑیں کاٹی ہیں

کتنی بار خوشحالی کی بنجر کوکھ میں

امید اُگانے کی خواہش بوئی ہے

اُجلی دنیا تعمیر کرنے کے لیے

مجھے خداؤں کے دل چاہئیں

میرے نام لکھے پیغمبروں کے خطوں میں

کہیں نہیں لکھا

کہ اختلاف کا رنگ سرخ ہے

پھر کیوں ہر روز آلودہ کفن دفنائے جاتے ہیں؟

میں نے فیصلہ کیا ہے

اپنی محبت کی شادی پر اُداس رہوں گا

اور میری ہونے والی بیوی

سادہ لباس میں بارات کا سواگت کرے گی

میں یہ نہیں دیکھ سکتا

میری شوخ مسکراہٹوں سے

عالمی جنگ میں مرنے والے

بے گناہ جذبوں کا اسقاطِ حمل ہو جائے

ادھوری موت کا کرب

اس نے مجھ سے محبت کی
میں نے اسے اپنا سینہ چھونے کو کہا
اس نے میرا دل چوم کر
مجھے امر کر دیا

میں نے اس سے محبت کی
اس نے مجھے دل چومنے کو کہا
میں نے اس کا سینہ چھو کر
اسے ابدیت بخشی

ہم دونوں جدا ہو گئے
جدائی نے ہمارے خواب زہریلے کر دیئے

یک سانسی موت اب ہماری پہلی ترجیح ہے

تنہائی کا سانپ ہمیں رات بھر ڈستا رہتا ہے

اور صبح اپنا زہر چوس کر

اگلی رات ڈسنے کے لیے

زندہ چھوڑ جاتا ہے

میں اچھا فن کار نہیں

پرندے مجھ سے دانا ہیں
اپنی معصومیت زندہ رکھنے کے لیے
ہجرت کر جاتے ہیں
لومڑیاں اپنا دشمن پہچان لیتی ہیں
بھیڑیں اپنی اُون سے خواب بُنتی رہتی ہیں
لوگ اپنے مالکوں کی لعنت سمیٹ کر بھی
ان کے قدم ماپتے رہتے ہیں

جیسے بھی ہو
زندہ رہنا ایک فن ہے
زندگی کے کھیل میں اب تک
میں اضافی کردار ہی رہا ہوں
جسے کبھی بھی کھیل بدر کیا جا سکتا ہے

رنگوں کی حقیقت

جہاں سے بات چلتی ہے

وہیں پر آ کے رکتی ہے

کہ رنگوں سے بنی ہے

ہر پرانی اور نئی تخلیق

ہر اک زندگی اور موت

ان کے درمیاں ہر چیز

زندہ اور مُردہ۔۔۔

زمیں اور آسماں کے راز

پانے والی آنکھیں بھی

حقیقت اور خوابوں کو ملانے والا رستہ بھی

تمہیں معلوم ہوگا!

کہ جب دو رنگ ملتے ہیں

نیا اک رنگ بنتا ہے

یہی اک قاعدہ ہے

جس پہ سب کچھ خلق ہوتا ہے

میں کہتا ہوں

کہ بے رنگی بھی اپنا رنگ رکھتی ہے

تمہاری اور میری زندگی دو رنگ ہیں

ہمارے ملنے سے جو رنگ پیدا ہوگا

ہم سے مختلف ہوگا

نئی تخلیق کی پوری صلاحیت کے ساتھ

میں ڈیپ فریزر میں پڑا رہ جاتا ہوں

چار عورتیں مجھے تقسیم کر لیں
یا میں چار عورتوں کو خود پر پہن لوں
جسموں سے موم بنانے کا ہنر سیکھوں
آنکھوں سے دیئے باندھ کر روشنی نیلام کروں
یا اندھیرا جمع کرنے لگوں
تو کیا میری ضرورت کی آگ
برف بن سکتی ہے؟

گائے کے پستانوں سے شہوت چھلکنے لگے
شہر کے وسطی حصے میں
جنسی کھلونوں کی دوکان کھول دی جائے
اور قحبہ خانوں کے سارے رستے ہموار ہو جائیں
میں اپنی نصف حس لامسہ کاٹ دوں
یا بنجر زمینوں میں مقدس جذبے دفنا دوں
تو کیا میری ضرورت کی آگ
برف بن سکتی ہے؟

میں ایک بچے کو پیدائش دوں

اس کے ننھے وجود میں

لمحہ لمحہ زندگی بھرتے ہوئے

اپنے قد کے برابر لے آؤں

اس کے لیے تراشے ہوئے

چند نسوانی جسم خرید لوں

یا میں بچپن اپنا لوں

اور سارا دن جھولا جھولتے ہوئے

جلتے سورج کے سامنے چمکتا رہوں

تو کیا میری ضرورت کی آگ

برف بن سکتی ہے؟

لیکن مجھے خدشہ ہے

ایسا کرنے سے ضرورت کی آگ اور بھڑک جائے گی

اسی خوف سے

آئینے کے سامنے کھڑے

ہر لمحے، وقت کا چہرہ بدل جاتا ہے

اور میں ضرورت کی آگ، برف کرنے کے لیے

حسرت کے ڈیپ فریزر میں پڑا رہ جاتا ہوں

ذات کے مرکزِ ثقل پر

مجھے دیوار کے دونوں طرف
واضح دکھائی دے رہا ہے
یہ دنیا اب کھلا میدان لگتی ہے
جہاں پر سرحدیں فرضی ہیں ساری
مری راتیں طمانیت سے خالی ہیں
میں سوتا ہوں تو دروازے سے
خدشوں کی کئی آنکھیں مسلسل جھانکتی ہیں
خواب سارے بستروں کی سلوٹوں میں کھو گئے ہیں
اب تو نیندیں بھی حقیقت کا اشارہ ہیں
جو ہونا ہے
جو آگے ہونے والا ہے

آنکھ کی سکرین پر پھیلا ہوا ہے

جسم میں اِک خوف گردش کر رہا ہے

میں تنہا رہ گیا ہوں

یہاں پر آدمی جنگل بنائے

صنوبر کے درختوں کی طرح پھیلے ہیں

جن کا ارتقا گردن کے لمبے ہونے میں ہے

اور پاؤں تو زمیں نے باندھ رکھے ہیں

آنکھ کی سرحد میں کوئی انساں اب باقی نہیں ہے

میں تنہا رہ گیا ہوں

سوچتا ہوں اب کہاں جاؤں!

یا مر جاؤں؟

کیسا لگتا ہے؟

کسی کی گرم ہتھیلیوں میں

کسی کی مٹھیوں کے پیچ وخم میں بھنچے

میٹھے ذائقوں میں ڈوب جانا

کمر کے چکنے کٹیلے زاویوں میں خود کو الجھا کر

جو چلنا تو پھسل جانا

زباں سے لمس لینا

کسیلی خوشبوئیں نتھنوں سے چننا

مرتعش اعضاء سے گرتے رنگوں کو آنکھوں میں بھرنا

ادھوری خواہشوں کو ہاتھ کی پوروں سے چھونا

چوم لینا

گھنے بالوں کے جنگل میں

چھپا اک غار کے اندر

لزوجت ڈھونڈنے جانا

کہ جس سے جڑ سکیں دو جسموں کے مرکز

تو اپنا ضبط کھو دینا

کبھی جب بات کا قابو سے باہر ہونا

ڈر جانا

کبھی جب ہار جانا

تو مر جانا

تمہارا تجربہ کیا بولتا ہے؟

بتاؤ۔۔۔!!

کیسا لگتا ہے؟

ہم اضافی مٹی سے بنے

روشنی قتل ہوئی

تو جسم خالی ہو گئے

زندگی کا غبار ہی ہمارا حاصل ہے

ہم نے پرائے گھروں کی راج گیری کی

اور اپنی چھت کے خواب دیکھے

ہمیں کب معلوم تھا

سوئی دو دکانوں کی سیڑھیاں ہمارا تکیہ ہیں

ہمارے نام اضافی مٹی پر لکھے گئے

اور ہم فقط لوگوں کو دہراتے رہے

ہم بے احتیاط لمحوں کا قصاص نہیں تھے

ہم حلال کے تھے

مگر بے گھر پیدا ہوئے

مجھے تمہارے میلے کپڑے نہیں پہننے

وقت نے میرے دل سے
بھیڑیے کے دانت باندھ دیے ہیں
میرے خون میں وحشت اُگنے لگی ہے

خوشیوں کی پرورش کرتے ہوئے
دکھ مجھ سے زیادہ قد آور ہو گیا ہے
زندگی نے مجھے بہت بے آرام کیا ہے
لہذا میں جسم میں موت کو پناہ دینے سے نہیں ڈرتا
میں ہیجڑوں کی طواف گاہ نہیں
جہاں تم اپنے ترس کی زکوۃ خیرات کر سکو
تمہاری ٹھوکر مجھے اس سے زیادہ نہیں توڑ سکتی

کیونکہ اب میں ہمدردی کی خواہش نہیں رکھتا

میں تم سے خفا نہیں!

صرف اِس بات پر افسردہ ہوں

کہ تم نے میری تنہائی کو

اپنے میلے کپڑے پہنا دیے ہیں

بیج کا کرب

(قاسم یعقوب کے لیے)

زندگی بہت مہنگی ہو گئی ہے

اتنی آمدن میں صرف بھوک ہی خریدی جا سکتی ہے

ضرورت جسم پر کسی نہ کسی جگہ چپکی رہتی ہے

پیٹ سے زیادہ مشکل نظریے سے لڑنا ہے

لیکن جنگ ایک محاذ پر ہو تو لڑی جا سکتی ہے

بھوک ایک عرصے سے

میرے بستر پر اونگھ رہی ہے

میں نے صبح اُس کے بوسے لے کر روزہ رکھا

اور افطاری کے لیے ایک کھجور

اُس کی کوکھ میں چھپا دی

مگر وہ بھی شام تک سرخ ہو جائے گی

اذیت سہنا اتنا مشکل نہیں، جتنا اُسے سوچنا

بیج کا کرب صرف پھول محسوس کر سکتا ہے

جس طرح تمہارا درد

میں محسوس کرتا ہوں

اظہار کا متروک راستہ

اظہارِ محبت کے لیے لازمی نہیں
کہ پھول خریدے جائیں
کسی ہوٹل میں کمرہ لیا جائے
یا پرندے آزاد کیے جائیں

اظہارِ محبت کے لیے تم اپنے بوسے
کاغذ میں لپیٹ کر بھیج سکتی ہو
جس طرح میں نے اپنے جذبے
تمہیں پوسٹ کر دیے ہیں

میرا دوسرا جنم

رات میرے صحن میں اتنی آنکھیں برسیں
کہ سارے راز لہولہان ہو گئے
میں نے پہاڑوں کی اوٹ چرائی
اور دھرتی پر بے لباس پھرا
خدا نے ٹھوکر ماری
تو زمین نے مجھے اپنی چھاتیوں میں پناہ دی
مجھے جس بھوک کی سزا ملی
وہ پیٹ کی تو نہ تھی

میں نے آدم کی غلطی دوہرائی
اور آج اپنا دوسرا جنم دن منایا

Hermaphrodite

اُس کو شک تھا

خدا نے دو آدھے جسم عمودا جوڑ کے

اس کو تعمیر کیا ہے

جس میں اِک حصہ اپنا اور ایک پرایا ہے

وہ آدھے آدھے دو جسموں کا حاصل ہے

وہ اکثر رات کے کالے چہرے سے ڈر جاتا

تو اپنی ہی گود میں چھپ کر رونے لگتا

خود سے باتیں کرتا

دیواروں سے سر ٹکراتا

اپنی تکمیل کی خاطر

دونوں آدھے جسموں کو

بستر پر تنہا چھوڑ کے

اپنے اصلی حصے کی تلاش میں کھو جاتا

لیکن خالی ہاتھوں کو جب

دوزخ کی جانب لٹکائے واپس آتا

تو گیلے بستر پر

اپنی ہی گردن میں بازو ڈالے

خود سے لپٹ کر سو جاتا

وعدہ میرے بدن کی زنجیر ہے

تم مجھے رڈی سے چھانٹی گئی کتابوں کی باس کہہ سکتی ہو
جو کِتنے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی
تمہارے لباس تک پہنچی ہے
سو تمہاری مانوسیت سراسر بیجگانہ ہے
کنواری عورت کی خوشیاں
میری خرید سے زیادہ مہنگی ہیں
کیونکہ میں اپنا اِطمینان
ایک بنیے کے ہاتھ گروی رکھ آیا ہوں

تُم سمجھ سکتی ہو

میں کتنے لمسوں کا مقروض ہوں

اِس لیے بیاہ میری خواہشوں کا کفارہ نہیں

میں وعدوں کے جیل خانے میں نہیں رہ سکتا

تم کسی اور وجود میں اپنی آنکھیں گوندھ لو

میں تُمہاری روح کا بادبان نہیں بنوں گا

ابھی تو مُجھے

کئی عورتوں کے بیوہ خوابوں کو

اپنے مُتجسس بدن کا سُود دینے جانا ہے

خشک بوتلیں، خالی گلاس

جب ایوانوں میں زندگیوں کے فیصلے ہوتے ہیں

تو پارکوں میں کھیلتے بچوں کے

خواب دان چھلک جاتے ہیں

ہم مُرجھائی شاموں میں کِھلے پھول

آخر کب تک مُسکائیں!

کیسے سازشوں کا رزق ہو جائیں؟؟

کیا کریں!

ہمارے ہاتھ پرائی زمینوں کے عوض گروی رکھ دیئے ہیں

ہماری آنکھیں سرحدوں سے باہر پڑی ہیں

ہم اتنا اِختیار بھی نہیں رکھتے

کہ اپنے زخموں کو لوری دے سکیں

بِکس طرف قدم آرائی کریں؟

تمام سیڑھیاں ہمارے صحن میں اُترتی ہیں

تجوریوں میں پڑے پڑے

ہم اور کِتنے بے وُقعت ہو جائیں؟

ہم خود کو پرچم کی جگہ نہیں گاڑھ سکتے

لہٰذا بدن میں دراڑیں پڑنے سے پہلے

ہمیں مرنے کے لیئے

اپنی پسندیدہ جگہ کا اِنتخاب کر لینا چاہیئے

غیر مرئی احساس

اُس شام
تمہاری یاد میں لکھی
نظم کی آخری لائن میں، میں
مرا پڑا تھا

مصنوعی رنگوں کے جسم

زندگی کی دیوار پر ہم اپنا نام
اُلٹے حروف سے لکھتے ہیں
اور اپنی گمشدگی پر کانپ جاتے ہیں
زمین ہمیں غیر محفوظ لگتی ہے
تو دوسرے سیاروں پر رہائش کا سوچنے لگتے ہیں
اپاہج پرندوں پر ہنستے ہیں
دنیا میں نفرت کا جواز اُگاتے ہیں
اور ڈائریوں میں محبت کا حساب رکھتے ہیں
ہم شادیوں پر بجتی شہنائی پر ناچتے نہیں
گھٹے ہوئے آنسوؤں کی سلامی دیتے ہیں
جب لوگوں کی سوچیں
کپڑوں کے اندر جھانکنے لگتی ہیں

تو ہم روشنی کو خدا

اور تاریکی کو شیطان کہہ دیتے ہیں

اپنی نیند میں، خشک ہوتے خوابوں کی

پنیری کاشت کرنے کے لیے

شیطان کے بستر پر برہنہ لیٹ جاتے ہیں

ہم اپنی بے اختیار آنکھوں کا الزام

تاریکی کو سونپ دیتے ہیں

پھر ایک تیز دن کی روشنی میں

شیطان کو کنکر مار کر گناہ اتارتے ہیں

اور پاک ہو جاتے ہیں

ردِّعمل کا ردِّعمل

لوگوں نے پہاڑ کے دامن میں
مجھے ایک لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا
فطرت کے تحفظ کے لیے
انہوں نے ندامت کے خنجر سے
اُس کے پستان کاٹ کر
اُس کی کوکھ میں بھر دیے
اور مجھے گدھے پر بٹھا کر
شہر کی جانب روانہ کر دیا

کل میں نے دو پرندوں کو
آپس میں چونچ رگڑتے دیکھا
فطرت کے تحفظ کے لیے
ندامت کے خنجر سے
میں نے تمام شہر کی گردنیں کاٹ دیں

+++ = +

ہم تین نہیں

میرا باپ

اپنے باپ کا

اور میں

اپنے باپ کا

اِرتقاء ہیں

بڑوں کے کھیل

ہم نے ہر چیز کا نام
اپنی مرضی سے رکھ لیا
اور زندگی سے مکر گیا

اپنے جوتوں کو بستر کا نام دیا
اور تلوے بچھا کر سو گئے

سمندر کی لہروں پر
صحرا لکھ دیا
ساحل پر ہمارے سائے
ریتلی آندھیوں میں ڈوب گئے

چیونٹیوں کو سانپ کہہ کر پکارا
جو ہمارے خوابوں میں
ڈسنے کے لئے رینگنے لگیں

تلواروں کو پھول تصور کیا
اور محبوباؤں کو تحفے میں بھیج دیں

خوف کا نام خوشی رکھا

اور جنگلی درندوں کے سامنے

بے دریغ قہقہے لگائے

خون کو پانی سمجھ لیا

اور پیاس لگنے پر

بے حساب قتل کیے

خطوں میں راز قید کیے

اور ہر گھر میں پوسٹ کر دیئے

بیٹے کو لڑکی

اور بیٹی کو لڑکا بنا لیا

ایک ہیجڑے نے دونوں سے شادی کی

کافی عرصے بعد

ایک بانجھ دن کی ویرانی میں

ہم دونوں نے موت کو آوازیں دیں

تو ہمارے گھر

دو بچے پیدا ہو گئے

عالمی ظالموں کے نام (۲)

معصوم بتوں کی پُوجا کرتے کرتے
ہمارے دل اِتنے پتھر ہو گئے
کہ اِجتماعی خودکشی کا اِتفاق بھی نہ رہا

لمحہ بھر فتح کے احساس نے
اِتنے رنگوں کا قتل کیا
ہم اپنے ہی خون کی وحشت میں ڈُوب گئے
کاش۔۔محبت کا رنگ سُرخ نہ ہوتا
اپنی محبوباؤں کو ہم
پیلے پھولوں کے تحفے بھیج دیا کرتے
اپنے زرد خوابوں سے مسہریاں سجا لیتے

ہم اِتنے صابر کیسے ہو سکتے ہیں

کہ برف گرے موسم میں

حدت بھرا ایک بوسہ جیتنے کے لئے

بھیگی اُداسی کے سارے موسم ہار جائیں!

پرچموں پر اِتنے ستارے بنا لئے گئے

کیا تاریکی اُجالنے کے لئے

ایک چاند کافی نہیں تھا؟

ظالمو!

ہمارے فلسفے میں سے شانتی کا درس پڑھو

ہمیں اِجتماعی قبروں میں دفناتے ہوئے

اِتنا تو پُوچھ لو

ہماری لاشیں ہم بستری پر

رضامند بھی ہیں یا نہیں؟؟

موت کے دِنوں میں انتظار

ہر رات' خواب میرے دروازے پر
آ کر پلٹ جاتے ہیں
میں چھ راتوں سے سویا نہیں
تھکی آنکھوں میں تمہارا عکس رو رہا ہے

آج خزاں کی عمر چھ دن ہو جائے گی
کئی دن ہوئے
میرے کندھوں پر پرندے نہیں بیٹھ رہے
میں اجتماعی زیادتی کا قہقہہ بنی
حاملہ عورت تو نہیں
پھر کیوں برہنہ درخت مُجھے دیکھ کر سہمے ہوئے ہیں!!
سمندر مسلسل چیخ رہا ہے
کیا اِسے ابھی تک قتل کیا جا رہا ہے؟

ایک دراڑ میری روح کو چیرتی جا رہی ہے
''کیا مجھے خودکشی کر لینی چاہیے؟''
یہ سوال تو مجھے ڈھنک ڈالے گا

کچھ تو کہو
کہ اپنے کھنڈر ہوتے بدن کو
دیمک لگنے سے بچا سکوں

تم چھ دن سے خاموش کیوں ہو؟

میں تُمہارے بدن میں گھر نہیں بناؤں گا

تمہارے لمس کا تعاقب
مُجھے نہیں جگا سکتا
کوئی اور حربہ آزماؤ
میری خوبصورتی نے میرا بہت نقصان کیا ہے
تم جتنی بھی مہربان ہو جاؤ
میرے پاس اِتنی گُنجائش نہیں
کہ تمہارے بدن میں ایک گھر بنا سکوں
میرے وجُود میں لگی موم بتیاں دیکھ کر
اِسے میری سالگرہ مت سمجھو
میں تو اپنی روح دفنانے جا رہا ہوں
بے مصرف تعلق مجھے کُترنے لگتا ہے
اِس لیے میں اپنا سارا بدن خالی کرنا چاہتا ہوں

مجھے معلوم ہے

میری قبر پہ

صرف کنواری عورتیں اگربتیاں جلانے آیا کریں گی

لیکن مجھے ثواب سے کیا غرض!

مجھے تو بس اپنی تنہائی دور کرنی ہے

آخر کب تک

میں آنسوؤں کی پرورش کروں

اور اپنے یومِ پیدائش پہ

کتبوں سے لپٹ کر روتا رہوں

مجھے اِک کام کرنا ہے

وہی کہنہ کہانی ہے
وہی باسی حقیقت ہے
جو برسوں سے اُسی اِک دائرے میں گھومتی ہے
پُرانی گالیاں ہیں
جنہیں ہر بار بک بک کر
مسوڑوں میں جلن ہونے لگی ہے
وہی مُردہ سے گھوڑے اور تُو رھا بادشہ ہے
جو صدیوں سے اُسی شطرنج کی دیوار سے باہر نہیں نکلے
اُنہی بے موسمی خوابوں کے کڑوے ذائقے ہیں
جو ہماری نیند نے بے خواب راتوں میں چکھے ہیں

نیا منظر کُھلے تو بات بنتی ہے
سیاہی کا گریباں چاک ہو تو رات ڈھلتی ہے

زاہد امروز ۱۹۸۶ء کو فیصل آباد شہر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی فنی زندگی کا آغاز زمانہ طالب علمی ہی میں شروع کیا۔ قائدِ اعظم یونیورسٹی سے فزکس میں ایم ایس سی کرنے کے بعد نیوکلیائی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ اور عالمی امن کے موضوعات پر تحقیق سے وابستہ ہیں۔ زاہد امروز فلسفۂ سائنس اور فلسفۂ ادب میں مماثلت کی تلاش میں دونوں راہوں پر گامزن ہیں۔ ''خودکشی کے موسم میں'' اُن کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں اُن کا جمالیاتی اور جذباتی شعور مل کر سامنے آیا ہے۔

یہ نظمیں ذات کے اندر پھیلی ہوئی غم کی وارداتیں ہیں۔۔۔ کہیں شخصی نوعیت کی اور کہیں وجودی سطح کی۔ یہ نظمیں زندگی اور انسانی صورتِ حال کے بارے میں بنیادی نوعیت کے سوال اٹھاتی ہیں جو ہمیں ناآسودہ کر دیتے ہیں۔ ان نظموں کی فکری جہتیں اور تخیل بھی ہیں اور معنی آفرینی بھی۔

آفتاب اقبال شمیم

اکثر شاعر اپنی شاعری میں موجود نہیں ہوتے مگر زاہد امروز پابلو نیرودا کی طرح اپنی شاعری میں موجود ہے۔ زاہد امروز کی نظمیں دکھ اور محبت کے موسموں کی رازدار سہیلیاں ہیں۔ محبت کے چرواہوں کے قبیلے سے تعلق رکھنے والا یہ شاعر انتہائی خاموشی سے ایک لازوال محبت کی کہانی کے کرداروں کی ورق گردانی میں مصروف ہے۔

مظہر الاسلام